# اسلام ازم اور
# مسلم شناخت
## مشرق وسطیٰ کے تناظر میں

ترجمہ اشرف طارق

ایلف کائی

مضمون نگار ایلف کائی کا تعلق مونٹ پیلئر، فرانس سے ہے۔ وہ ایک صحافی اور میڈیا کی تجزیہ کار ہیں۔ ترک سیاست، اسلام ازم، ضد سامیت وغیرہ ان کے خاص موضوع ہیں۔

شناخت کے مسئلے کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ دوسرے آپ کو کس زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں، اس سے ''دوسروں'' کے خدشات اور تحفظات کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ زیر نظر مضمون ایک یہودی مضمون نگار کی قلم سے ہے، جس میں مشرق وسطی کا سیاسی و مذہبی تناظر پیش نظر ہے۔ اس وقت عالمی سیاست کے خدوخال کی تربیت میں جو انداز فکر کارفرما ہے اس مضمون کے مطالعہ سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

ایک تبصرہ نگار کے لیے جو صیہونیت اور اسرائیل کے ضمن میں مسلمانوں کے رویوں کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے، یوم القدس کی تقریب بہترین مثال ہے۔ اس دن کے منانے کا آغاز ایران کے روحانی پیشوا آیت اللہ خمینی نے ۱۹۷۹ء، اسلامی انقلاب کے سال میں کیا تھا جو کہ ماہ رمضان کے آخری جمعہ کو منایا جاتا ہے اور یہ دن یروشلم پر اسرائیلی قبضے کے خلاف احتجاج کے لیے وقف ہے۔ یروشلم ان تین شہروں میں سے ایک ہے جنہیں مسلمان مقدس خیال کرتے ہیں۔

یوم القدس نے عرب اور اسلامی دنیا میں ایک رواج کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ابھی حالیہ سالوں سے یوم القدس یورپ میں بھی منایا جانے لگا ہے۔ برلن، پیرس، ٹورنٹو اور لندن جیسے شہروں میں مسلمان سرگرم ارکان نے غیر مسلم بائیں بازو کے حامی لوگوں کے ہمراہ گلی کوچوں کا رخ کیا ہے۔ ان تقریبات کے دوران لگائے جانے والے بہت سے نعرے، خاص طور پر ''صیہونیوں کے خلاف ہاتھ میں ہاتھ دو'' یورپی بائیں بازو کے حامیوں کے لیے نوک پلک درست کر کے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ تاہم سامیوں (یہودیوں) کے خلاف نعرے مثلاً ''اسرائیل مردہ باد'' بھی مظاہروں کے دوران منظر عام پر آتے ہیں جس کی وجہ سے یوم القدس کے بطور سامی مخالف تشخص میں کوئی شک نہیں رہتا۔ درحقیقت، برلن میں یوم القدس کے سلسلے میں منعقد کیے گئے ۲۰۰۲ء کے مظاہرہ کے دوران اسرائیل کی تباہی کے نعرے توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ اگلے سال صیہونیت کی مخالفت کے خدوخال ایک جوابی مظاہرے کی وجہ سے واضح ہوئے۔

اس تناظر میں کہ ''صیہونیت'' کا حقیقی مفہوم کیا ہے، دو واضح خیالات پائے جاتے ہیں: اول یہ کہ مسلمانوں کے خیال میں صیہونیت کینہ پروری اور دشمنی کا دوسرا نام ہے۔ دوسرا یہ کہ، ایسے کسی تصور کی کوئی حقیقی بنیاد موجود نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ بہت سے مسلمانوں کے ذہنوں میں صیہونیت کا یہ مفہوم کیسے آیا، خاص طور پر ان مسلمانوں کے ذہنوں میں جو مسلم ممالک میں نہیں رہتے۔ ترکی زبان میں موجود اسلامی ادب کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ منفی مفہوم پہلے سے موجود نہیں تھا بلکہ مشرق وسطیٰ کے مسئلہ کی وجہ سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سامنے آیا۔ خاص نتیجہ یہ نکلا ہے کہ غیر یقینی صورتحال سے دوچار دنیا میں ''صیہونیت'' کی مخالفت جزو ایمان اور اسلامی شناخت کی علامت بن چکی ہے۔

## ''صیہونیت'' کے موضوع پر اسلامی مکالمہ

صیہونیت کے موضوع پر عربی زبان میں موجود اسلامی ادب کے مقابلے میں ترکی ادب زیادہ مقبول نہیں ہے۔ تاہم، ترک زبان میں موجود ادب کئی وجوہات کی بناء پر اہم ہے۔ ان وجوہات میں ترکی اور اسرائیل کے

> دنیا میں تین سمتیں ہیں: کمیونزم، صیہونیت یا قوم پرستی اور ہر قوم کی مقدس چیزوں کا احترام۔ ہمیں تیسرے راستے کا انتخاب کرنا چاہیے۔

درمیان روایتی طور پر مضبوط سفارتی اور عسکری تعلقات اور یورپ میں بڑی تعداد میں ترک مسلم کمیونٹیوں کا وجود ہے۔ علاوہ ازیں، جبکہ سیاسی اسلام کا مطمح نظر ایک عالمی برادری یا امہ کی تخلیق کرنا ہے جو کہ لسانی یا قومی سرحدوں سے آزاد ہو، مگر تجزیاتی مقاصد کے لیے اس کے قومی متغیرات کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

مسلم دنیا میں صیہونیت کی مخالفت ہمیشہ یکساں نہیں تھی۔ دراصل، چند عرب رہنماؤں نے، جن میں فیصل ابن حسین قابل ذکر ہیں، جو ۱۹۲۱ء میں عراق کے بادشاہ بنے، صیہونی تحریک کے ساتھ موافقت کے خواہاں تھے۔ ۱۹۱۷ء کے اعلان بالفور کے ذریعے برطانوی حکومت نے یہودیوں کو فلسطین میں ایک ''قومی وطن'' دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس اعلان کے بعد آنے والے سالوں میں صیہونیت کے لیے عرب دشمنی مستقلاً شدت اختیار کرتی گئی۔ ترکی جو کہ سلطنت عثمانیہ کی راکھ سے ظہور پذیر ہوا، وہاں اس عرب مخالفت کی بازگشت تیزی سے نشوونما پانے والی اسلامی تحریک کی کتابوں اور جریدوں میں سنائی دی۔ ان ذرائع کی وجہ سے مسلم دنیا میں صیہونیت کی مخالفت کے نظریاتی ارتقاء کا سراغ لگانے میں مدد ملتی ہے۔

جن سالوں میں سلطنت عثمانیہ زوال پذیر تھی، خلافت (دیگر الفاظ میں اسلامی حکومت) کے خاتمہ کے متعلق سازشی نظریات گردش کر رہے تھے۔ یہ نظریات نہایت زیادہ سامی مخالفت پر مبنی تھے۔ ان میں یہ تاکید موجود تھی کہ ینگ ترک موومنٹ (Young Turk movement) جس نے عثمانی دور حکومت کا خاتمہ کیا، دراصل یہودیوں، فری میسن تحریک (دوسرے ممالک میں انقلاب بپا کرنے والی ایک صیہونی تنظیم) اور ڈونمہ (مختلف ذیلی ذاتوں پر مشتمل یہودیوں کی ایک جماعت) کی ایک سازش تھی۔ بنیادی دعویٰ یہ تھا کہ ترک جمہوریہ حقیقتاً ایک ''یہودی'' جمہوریہ ہے۔ سازشی نظریات بنانے والوں نے بطور شہادت اس حقیقت کی نشاندہی کی کہ ینگ ترک موومنٹ کی بہت سی سرکردہ شخصیات یونان کے شہر سیلونیکا سے تعلق رکھتی تھیں اور سیلونیکا شہر سفاردی یہودیوں کا مرکز تھا۔ ''ہولوکاسٹ (نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل عام) کے بارے میں پائے جانے والے منفی رویوں کی وجہ سے نازی ازم اور صیہونیت کے درمیان موازنہ پیدا کرنے کے سلسلے میں فلسطینی قومی تحریک کی حوصلہ افزائی ہوئی۔''

۱۹۲۰ء کے عشرہ کے آغاز کے ساتھ ہی ''صیہونیت'' اور صیہونی کی اصطلاحات بتدریج مسلمانوں کے زیر استعمال آنے لگیں۔ ۱۹۴۸ء کے دور سے پہلے کے دو بااثر سامی مخالف مصنفین (Pan Turkish Movement) سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک مصنف نہال اطسز (Nihal Atsiz) تھے جنہوں نے صیہونیت کے بارے میں نسلی نظریات کا پرچار کیا اور دوسرے سیوت ریوت اطلحن (Cevat Revat Atilhan) تھے جنہوں نے اسلامی تشخص سے آگاہی پیدا کرنے کا مقصد اپنایا۔ اپنی تحریروں میں ان دونوں شخصیات نے ''صیہونی'' کی اصطلاح ''یہودی'' کے مترادف کے طور پر استعمال کی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ یہودیوں کو ایک دشمن کے طور پر پیش کیا۔

اطلحن (Atilhan) کے نظریات ترک اسلام ازم میں سامیوں کے لیے موجود فطری مخالفت اجاگر کرتے ہیں، جو کہ اسرائیل کے وجود میں آنے کے بعد فوری طور پر شدت اختیار کر گئی۔ رفعت این بالی، ترکی اور یہودی معاملات کے مورخ ہیں۔ ان کے مطابق اسلامی جریدے "سبیل

الرشاد" کے ایک تہائی مضامین صیہونیت اور یہودیت سے متعلق تھے۔ عرب قوم پرستوں اور دیگر مسلمانوں کی طرف سے ہولوکاسٹ (Holo Caust) کے صحیح حقائق کو تسلیم کرنے کے انکار کے پیچھے کافی حد تک انہی تصورات وخیالات کا اثر تھا۔ نتیجے کے طور پر، صیہونیت کے مفہوم کی تشکیل کے دوسرے فیصلہ کن مرحلے کا آغاز ہوا۔ ہولوکاسٹ (Holo Caust) کے بارے میں منفی رویے ممکنہ طور پر نخوت سے لبریز اور مبہم تھے اور اس سے بھی بری صورت یہ کہ ہولوکاسٹ کے انکار پر مبنی تھے۔ ان منفی رویوں کی وجہ سے بین الاقوامی سیاسی منظرنامے پر نازی ازم اور صیہونیت کا موازنہ کیے جانے کا عمل متعارف ہوا تا کہ نازی ازم کے بارے میں پائے جانے والے مغربی اعتراضات اور صیہونیوں کے مخالف لوازمات میں مماثلت دکھائی جا سکے۔ ۴ر دسمبر ۱۹۶۱ء کو تنظیم آزادی فلسطین (پی ایل او) کے صف اول کے راہنما احمد شکیری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا: ''صیہونیت فسطائیت سے زیادہ بدتر، نازی ازم سے زیادہ بدصورت اور سامراجیت سے زیادہ قابل نفرت اور خطرناک ہے۔ صیہونیت ان تمام خواص کا مجموعہ ہے۔'' نتیجتاً، اسی طرح کے جذبات کا اظہار عرب دنیا سے باہر ترکی سے پاکستان تک کیا جانے لگا۔

تصورات کے درمیان یہی ربط مروج تشبیہات واستعارات میں شامل کر دیا گیا جس کی وجہ سے یہ تصورات وخیالات لوگوں میں گفتگو کا عام موضوع بن گئے۔ اگر پچھلے چالیس برس کے دوران مشرق وسطی میں رونما ہونے والے واقعات پر نظر دوڑائی جائے تو ہر واقعہ نے صیہونیت اور نازی ازم کے درمیان ربط استوار کرنے اور سامی مخالف سازشی نظریات کے اجراء کے لیے بنیاد فراہم کی۔ جون ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ، ۱۹۸۲ء کی لبنان جنگ اور پہلے اور دوسرے فلسطینی انتفادہ نے نازی ازم سے مماثلت قائم کرنے کے کافی مواقع فراہم کیے۔ جہاں تک ''یہودیوں کی طاقت'' کے بارے میں پائے جانے والے سازشی نظریات کا تعلق ہے، یہ ہمیشہ گردش کرتے رہے ہیں، جو ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کی گھناؤنی واردات کے بعد بام عروج تک پہنچ گئے۔

## سامراجیت مخالف دور میں یہودی مخالف تصورات

۱۹۶۰ء کے عشرہ کے دوران مغرب اور مشرق وسطی کے علاقوں میں اسرائیل وفلسطین کے تنازعہ کی سامراج مخالف توضیح کے ضمن میں صیہونیوں کو بطور نوآبادیات کار اور فلسطینیوں کو بطور مظلوم آبادی سمجھے جانے کے تصور کو فروغ حاصل ہوا۔ مگر اس کی وجہ سے نمایاں اسلامی نقطہ نظر مدہم نہیں ہوا۔ نوآبادیت کی مخالفت کی بجائے مسلمانوں کی جانب سے صیہونیت کی مخالفت اس وجہ سے زیادہ پختہ ہوئی کیونکہ مسلمانوں کو یہودیوں کے خلاف جنگ میں دھکیل دیا گیا تھا۔

اگر زیادہ باریک بینی سے دیکھا جائے تو کسی اور علاقے میں ہونے والے اسلامی بحث مباحثے کی طرح ترکوں کے ہاں بھی دو اہم موضوعات مشترک تھے یعنی مغربی اثرات اور کلچر کو مسترد کرنا اور یہودیوں کے مخالف فن خطابت اور مناظروں کی معیار بندی۔ اربکان (جو ۱۹۹۶ اور ۱۹۹۷ء کے دوران ترکی کے وزیراعظم رہے) ملی گوروُ دستاویز (قومی بصیرت) کے مصنف تھے۔ ۱۹۶۹ء میں اخبار ملیت (Milliyet) کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا: ''دنیا میں تین سمتیں ہیں: کمیونزم، صیہونیت یا قوم پرستی اور ہر قوم کی مقدس چیزوں کا احترام۔ ہمیں تیسرے راستے کا انتخاب کرنا چاہیے۔ ۱۹۷۰ء میں اپنی پہلی سیاسی پارٹی، ملی نظام پارٹی، کا قیام

> اسرائیل کو ماننے سے انکار خاص طور پر مغرب میں موجود مسلمان اقلیتوں کے ہاں ان کی شناخت کے احیاء کا ایک اہم پہلو بن چکا ہے۔

کرتے وقت انہوں نے اعلان کیا کہ پارٹی کی رکنیت ''یہودیوں اور فری میسن لوگوں'' کو نہیں دی جائے گی۔ یورپ میں اسلام پسند سرگرم اربکان کی اس دلیل کو دہراتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ چند ایک معاملات میں وہ یہودیوں، جو ایک مذہبی گروہ کے علاوہ کچھ اور نہیں اور صیہونیت، جو اسلام مخالف کینہ پرور ذہنی کیفیت ہے، میں تمیز کرنے میں خاص احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ انہیں صیہونیت کے مخالف یہودی افراد اور گروہ اپنے ساتھ ملانے میں بھی کامیابی حاصل ہو جاتی ہے جو طوطے کی طرح ان کے خیالات کو دہراتے ہیں۔ مثال کے طور پر لندن میں منائے جانے والے یوم القدس کے ناظمین نے یقینی بنایا کہ کٹر یہودی فرقے، نیچورے کرتا (Neturei Karta) کے ارکان مظاہرہ کے دوران صیہونیت مخالف نعروں کی نمائش کرتے ہوئے سب سے آگے مارچ کریں۔ برطانیہ میں اسلامی انسانی حقوق کمیشن نے مئی ۲۰۰۶ء میں ''صیہونیت کے خلاف یہودیوں کے خیالات'' کے عنوان سے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا۔ مقررین میں کینیڈا کی ایک بہت شدید کٹر علمی شخصیت یاکوف ربکن

(Yakov Rabkin) بھی شامل تھے۔ان افراد اور گروپوں نے بلا شبہ مسلمانوں کے اس اعتقاد کو کہ یہودیت ایک ایسا مذہب ہے جس میں تحریف شدہ تورات کو مانا جاتا ہے، کبھی چیلنج نہیں کیا۔

اس الزام کی عکاسی کرنے والا کینہ پروری پر مبنی مواد خاص طور پر احمد کلکان(Ahmed Kalkan) کی تحریروں میں ملتا ہے۔ وہ ایک مسلمان مصنف ہیں جن کی تصانیف جرمنی کے ترک کتب خانوں میں عام دستیاب ہیں۔ کلکان جو کہ فرانس اور ہالینڈ میں قیام پذیر رہے۔ ان کے مطابق مسلم شناخت کا تنزل یہودی بننے کے عمل کی طرف لے جاتا ہے۔ کلکان ''یہودیت'' کی بہت سی خصوصیات کی فہرست بیان کرتے ہیں۔ان میں سے ''خدا کے ساتھ وعدہ توڑنا، بندروں میں تبدیل ہونا، سازشیں، بہتان کا فقدان اور انبیاء کا قتل، ظلم، دغا، خدا کی مذمت اور حسد کے احساسات کو سمجھنے میں ناکامی ہیں۔ وہ خنازیر کی طرح رہتے ہیں اور اس طرح سوروں کی شکل لیتے ہیں.....'' یہ پیرا ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے'' سب سے زیادہ خطرناک سمندر پار کے یہودی نہیں ہیں بلکہ ہمارے اندر کا یہودی ہے---''

اسرائیلی بربریت کا شکار نہتے فلسطینی مسلمان

## یورپ میں شناخت کا بحران

مشرق وسطیٰ اور وسیع تر اسلامی دنیا کی طرح یورپ میں رہنے والے مسلمانوں کی اکثریت اس تاریخی پس منظر سے واقف نہیں ہے جس میں صیہونیت نے تیزی سے ترقی کی اور اس کے ساتھ ساتھ ان سیاسی رجحانات سے بھی آگاہ نہیں جو صیہونی تحریک کے اندر کارفرما تھے۔ چونکہ یہ اصطلاح بذات خود منفی تصورات سے جڑی ہوئی ہے لہذا تاریخی طور پر موجود فہم حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔

فہم حاصل ہونے کی راہ میں یہ رکاوٹ بہت ہی جذباتی اور نفسیاتی پہلوؤں سے منسلک ہے۔ اسرائیل کو ماننے سے انکار خاص طور پر مغرب میں موجود مسلمان اقلیتوں کے ہاں ان کی شناخت کے احیاء کا ایک اہم پہلو بن چکا ہے۔ صیہونیت کو سمجھنے کی کوشش فلسطین کو چھوڑنے کے مترادف ہے جو کہ دارالاسلام کا ایک اٹوٹ حصہ ہے، لہذا یہ بذات خود اسلام کو چھوڑنے کے برابر ہے۔ اگر جذباتی پیرائے میں بات کی جائے تو اس صیہونیت کو سمجھنے کی کوشش مسلمانوں کی شناخت سے غداری تصور کی جائے گی۔ ایک مسلمان جو صیہونیت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہ مسلمان نہیں رہتا۔

یہ بات صریحاً واضح ہے کہ ہر مسلمان اسی طریقے سے نہیں سوچتا۔ یہ کہنا ممکن ہے کہ صرف ایک بہت تھوڑی تعداد دانستہ طور پر اس تصور سے اتفاق رکھتی ہے۔ مگر یورپی مسلمانوں میں احتجاج کی شدت اور درجہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ گروہ سامیوں کی مخالفت کے بارے میں ردعمل دلی طور پر ظاہر نہیں کرتے اس حقیقت کے باوجود کہ اسے صیہونیت کی مخالفت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

عدنان اختر کی تصنیفات، جنہیں ان کے قلمی نام سے یاد کیا جاتا ہے اس ضمن میں ایک نمایاں مثال ہیں۔ اختر ایک بہت ہی اکھڑ مصنف ہیں مگر ان کی تصنیفات کثیر تعداد میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کی وجہ سے ان کو شہرت بھی حاصل ہوئی۔ انہوں نے اسلام کی اشاعت کے لیے درجنوں کتابیں اور مضامین لکھے ہیں جن میں انہوں نے ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو ہدف تنقید بنایا اور یہ ان کا محبوب موضوع ہے۔ وہ اپنی مشہور کتاب 'یہودیت اور فری میسن اوصاف' میں کہتے ہیں کہ ترکی کے یہودیوں اور فری میسن باشندوں کا بڑا مقصد ملک کی اخلاقی، مذہبی اور روحانی اقدار کو تباہ کرنا ہے۔ وہ صیہونیت کو ''مذہب کے بجائے ایک نسلی نظام فکر قرار دیتے ہیں، جس کا مقصد دنیا پر غلبہ حاصل کرنا ہے اور یہ دنیا کے امن کے لیے ایک خطرہ ہے''۔ اختر مزید کہتے ہیں کہ صیہونیت یہودی ریاست تخلیق کرنے کے لیے بنائی گئی ایک تحریک نہیں ہے، یہ دیگر رازوں کو چھپانے کے لیے محض ایک پردہ ہے جن کے بارے میں مغرب میں زیادہ معلومات نہیں۔ اس قسم کی باتیں عالمگیری تسلط کے بارے میں صیہونیت کے مقصد کو بیان کرنے والے سازشی نظریات ہیں۔ جب ان خیالات کا اختر کی دیگر تحریروں سے موازنہ کیا جاتا ہے جن میں یہودیت کو صریحاً دشمنانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے اور وہ ہولوکاسٹ کے انکار کا پرچار کرتی ہیں، تو سامی مخالف جذبات

اور صیہونیت کی مخالفت کے پہلوؤں کو الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

## نوجوانوں کا رخ

یورپی نوجوانوں میں ایسی تحریریں زیادہ مقبولیت رکھتی ہیں جن کا خاکہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ مگر دیگر عوامل بھی کارفرما ہیں۔ مسلمانوں کی شناخت شکستہ اور پیچیدہ ہے جو خاندانی اثرات، آمدنی، سماجی ماحول، غیر مسلم معاشرے میں رہائش اختیار کرنے کی وجہ سے عام اثرات اور ان معاشروں میں مسلمانوں کے خلاف بڑھتے ہوئے تعصب جیسے متغیرات کی وجہ سے متعین ہوتی ہے۔ نتیجے کے طور پر سیاسی معاملات زیادہ محفوظ شناخت کے لیے ایک بنیاد مہیا کر سکتے ہیں۔ قرب و جوار میں مسجد تعمیر کرنے کے معاملے پر عوامی بحث اور تنازعات، آیا نوجوان خواتین کو حجاب پہننے کا حق حاصل ہے، آیا مشرق وسطیٰ میں امریکی اور یورپی مداخلت اسلام کے خلاف جنگ بنتی ہے یا نہیں، اس طرح کی تمام چیزیں فلسطینیوں کے بطور مظلوم ہونے کی مماثلت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو یہ شناخت اس مسلمہ سوچ پر مبنی ہے کہ مسلمانوں کی شناخت میں سیاسی اور مذہبی پہلو مضمر ہیں لہٰذا اسی وجہ سے جو چیز اقوام کے درمیان تنازعہ کا باعث ہوتی ہے وہ مذاہب کے درمیان چپقلش کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

''مظلوم'' بمقابلہ'' ظالم'' کی شناختوں کے تصادم میں وہ لوگ جنہیں معاشرے میں ضم کر لیا جاتا ہے اور قبولیت بخش دی جاتی ہے، برخلاف ان کے جنہیں یہ شرف نہیں بخشا جاتا، یہ بالکل قابل قبول ہے کہ یہودیوں کو یہودیوں کی حیثیت سے تنقید کا نشانہ بنایا جائے۔

یورپی مسلمانوں کے لیے فلسطین کی بڑھتی ہوئی اہمیت انٹرنیٹ، سیٹلائیٹ ٹیلی ویژن اور ٹیکنالوجی کی دیگر ایجادات کے ذریعے عالمگیر ہو جانے کی وجہ سے ممکن ہوئی۔ ان ایجادات کی وجہ سے ابلاغ میں سہولت واقع ہوئی ہے۔ یہ معلومات تارکین وطن کی دوسری اور تیسری نسلوں کے امتیازی حالات سے بھی سامنے آتی ہیں۔ نوجوان گزرے ہوئے لوگوں کی شناخت کے تنگ نظری پر مبنی پہلوؤں کو رد کر دیتے ہیں، جن میں زبان اور خاص قسم کے مذہبی اور ثقافتی رواجوں کی تاکید موجود تھی اور اسے فرانسیسی ماہر عمرانیات اولیور رائے (Olivier Roy) ''ابتدائی دور کی وجہ سے آنے والے بحران'' سے تعبیر کرتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یورپ میں پیدا ہونے والے نوجوان مسلمان ایسے ساتھیوں کے ساتھ گہرے ربط میں ہوتے ہیں، جو اپنے نسب کی تلاش دیگر ممالک میں کر رہے ہوتے ہیں۔ یہاں پر عرب اور غیر عرب ممالک کے مسلمانوں کے درمیان تعلق کے حوالے سے ایک دلچسپ سوال پایا جاتا ہے۔ اگر جرمنی کو مثال بنایا جائے تو ان تارکین وطن کی تعداد جن کا اصل تعلق مشرق وسطیٰ سے ہے، لبستا کم ہے مگر اس گروہ کے ایک بہت بڑے حصہ کو ان معاشروں میں ضم ہونے کے سنجیدہ مسائل کا سامنا ہے۔ ان میں سے اکثر خانہ جنگیوں کی وجہ سے ان ممالک میں آئے ہیں نہ کہ سیاسی ظلم کی وجہ سے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان میں سے نہایت قلیل تعداد کو پناہ گزینوں کی حیثیت دی جاتی ہے۔ جہاں تک دیگر تارکین وطن کا تعلق ہے ان کی صورتحال کو ''برداشت کی جانے والی حیثیت'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

دیگر ترک وطن کرنے والی آبادیوں میں بے روزگاری کی شرح ۱۸ فیصد اور ۲۸ فیصد کے درمیان ہے، جبکہ عرب ممالک سے آنے والے پناہ گزینوں میں یہ شرح ۹۰ فیصد کے قریب ہے۔ برلن میں سن ۲۰۰۶ء میں غیر ملکی طلباء کے تیسرے حصے سے بھی زائد نے گریجویشن کرنے سے قبل ہی سکول چھوڑ دیا۔ لبنان سے تعلق رکھنے والے پناہ گزینوں کے بچوں میں اس ناکامی کا تناسب دوگنا ہے۔ یہ انتہائی خراب قانونی اور معاشی صورتحال ان معاشروں کے اندر ضم ہونے کا عمل نہایت مشکل بنا دیتی ہے۔ اس خلا کی وجہ سے انتہا

پسندانہ اور سامی مخالف نظریات کو زیادہ سامعین میسر آ جاتے ہیں اور اس طرح یہ نظریات حالات و مقاصد کے مطابق ڈھال لیے جاتے ہیں۔ اس قسم کے نظریات برلن کے کروز برگ اور نوکولن اضلاع کے سکولوں میں مقبول غنائی ریپ گانوں کی صورت میں جھلکتے ہیں۔

''میں ایک نازی ہوں/ ہاں تو پھر کیا ہوا/ تم دوسرے نازی لوگو/ نہ مت کہو/ ہر یہودی خنزیر کو قتل کر دو/ ان سب کو مر جانا چاہئے/ یہاں پر عرب

چھانے والے ہیں/فلسطین غلبہ پانے والا ہے/اللہ اکبر''

یہ گیت نہایت درشت انداز سے صراحت کرتا ہے کہ شناخت کے مختلف پہلوؤں کو کیسے یکجا کیا جاتا ہے۔ یعنی نازی نظریہ سے اس کے سامی مخالف پہلوؤں کی بنیاد پر ہمدردی اور عرب قوم اور فلسطین سے خصوصی چاہت۔ مگر زیادہ متاثر کن بات یہ ہے کہ اصطلاحات ''صہیونیت'' یا ''صہیونی'' وغیرہ کو بطور زبان زد الفاظوں کے طور پر استعمال کرنے کو ضرورت نہیں سمجھا جاتا۔ ''مظلوم'' برخلاف ''ظالم'' کی شناختوں کے تصادم میں وہ لوگ جن کو معاشرے میں ضم کرلیا جاتا ہے اور قبولیت بخش دی جاتی ہے برخلاف ان کے جنہیں یہ شرف نہیں بخشا جاتا، یہ بالکل قابل قبول ہے کہ یہودیوں کے بارے میں بات کی جائے۔ یقیناً یہ مثال مجموعی طور پر نوجوان یورپی مسلمانوں پر صادق نہیں آتی۔ یہ مثال صرف ممکن کو ظاہر کرتی ہے، یعنی کہ کس آسانی کے ساتھ ضد سامی زبان اور تشبیہات کے بارے میں ناقد جدید یورپ کی پابندیوں کو توڑ دیا جاتا ہے۔

## نتیجہ: اصلاح کے نقصانات

ان پریشان کن حقیقتوں کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنے کی مثبت مثالوں سے صرف نظر نہیں کیا جانا چاہئے۔ ایک اچھی مثال وہ محضر ہے جسکا عنوان ''سامی مخالفت: بالکل برداشت نہیں'' تھا۔ اس محضر پر سرکردہ ترک بائیں بازو کے لوگوں نے دستخط کیے اور اکتوبر ۲۰۰۴ء کو ترکی کے سوشلسٹ جریدہ بریکیم (Birikim) میں شائع ہوا۔ مگر اس محضر سے بھی ایک مشکل سوال جنم لیتا ہے: کیا اس محضر کی طرح کے اقدامات کے بارے میں قرار دیا جا سکتا ہے کہ انہیں واقعتاً مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے؟ بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے اس محضر پر دستخط کیے وہ خود یہودی تھے۔ دیگر لوگ جنہوں نے دستخط کیے ان کی خواہش تھی کہ انہیں مسلمانوں کے طور پر نہ پہچانا جائے یا یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ ساتھی مسلمانوں کی طرف سے اس ضمن میں اظہار کر رہے ہیں۔

''یہ محض مسلم دنیا کا مسئلہ نہیں، اب مغرب میں بھی صیہونیت کی مخالفت قابل قبول مکالمہ کے دائرہ کار کا جزء ہے۔''

علاوہ ازیں سامیوں کی مخالفت کے ضمن میں مزاحمتی ردعمل کا آپ سے آپ یہ مطلب نہیں ہے کہ صیہونیت کی مخالفت موجود نہیں۔ یہ محض مسلم دنیا کا مسئلہ نہیں، مغرب میں بھی صیہونیت کی مخالفت سیاسی طور پر قابل قبول مکالمہ کے دائرہ کار کا جزء ہے۔ صیہونیت کے بارے میں پائی جانے والی مغربی ناگواری مسلمانوں کو اپنی حیثیت کو فروغ دینے میں خاص طور پر اس بڑھتے ہوئے احساس کی وجہ سے آسانی فراہم کرتی ہے کہ صیہونیت کو اگر زیر بحث لایا گیا تو اس کی منفی تصویر کشی کی جائے گی۔

برلن میں ۲۰۰۶ء میں منعقد ہونے والا یوتھ تھیٹر پراجیکٹ اس رویے کی ایک نمایاں تشریح پیش کرتا ہے۔ اس ڈرامے کو ''کمرہ جماعت میں انتفادہ'' کا نام دیا گیا اور اس کی تائید بہت سے مقامی سیاستدانوں اور این جی اوز نے کی۔ اس ڈرامے میں یہودیوں کی منفی تصویر کشی کے بارے میں چند شکایات اجاگر کی گئی تھیں۔ اس ڈرامے کے فنکاروں میں سے ایک نے دوسرے فنکار کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا ''ہم یہودیوں کے خلاف نہیں ہیں۔ ہم اسرائیلیوں کے خلاف ہیں''۔ اس قسم کے بیانات ہی اسلام پسند سننا چاہتے ہیں اور سامعین، جن کی اکثریت استادوں پر مشتمل تھی، ان کی طرف سے ست ردعمل ہی وہ چیز ہے جسے فنکار دیکھنا چاہتے ہیں۔